سُرمگیں چشم کے بیمار کی ہے جلد خبر
بولتا ہی نہیں کہتے ہیں بڑی دیر ہوئی

مہلت

مہلت تخلص اور نام مرزا علی ہے۔ لکھنؤ کا رہنے والا ہے۔ شاعری میں جرأت سے اصلاح لیتا تھا۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ علی نقی محشر سے کسی تنازعہ کے باعث دونوں ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ ہوئے۔ مہلت کو علی نقی کے ہاتھوں کاری زخم لگا۔ پوچھنے والوں کے ہزار اصرار پر بھی اس کا نام زبان پر نہ لایا اور یہ ہی حال محشر کا تھا۔ اسی زخم سے اس کی روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔ یہ شعر اس کا ہے :۔

مرنے کے بعد بھی نہ گئی دل کی یہ تپش　　آرام زیر خاک بھی اب خاک کیجئے

میر

میر تخلص ہے۔ فصیحوں میں سب سے بڑھ کر فصیح، یہ شاعروں میں سے بڑھ کر شاعر، بلند مرتبہ سخنور، محمد تقی نام ہے۔ اکبر آباد والوں میں سے ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کی بہن کا فرزند ہے۔ اس کے مزاج میں لطافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کا کلام بلبل کی نغمہ سنجی اور خوش الحان مرغانِ چمن کی نالہ و بکا ہے۔ اس کا نطق شکر کی بارش کرتا ہے۔ اس کی فغان سے سخن کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اس کا قلم گویا کاغذ پر چمن سجاتا ہے۔ اس کا سخن جیسے مقید پرندوں کی فریاد ہے۔ اس کے خیال کے میدان میں گویا دل کو خوش آنے والے افکار کے معشوقان اپنا جلوہ بے دریغ بکھیرتے ہیں۔ اس کا شعر عاشق کی امید و بیم کی مانند رنگ برنگ کا ہے۔ اس کے قلم سے تازہ مضامین کے پھول کھلتے جاتے ہیں۔ اس کا

ایک مصرع تاثیر کے لحاظ سے ایسی گھنیری گھٹا کے مثل ہے کہ جس سے سیکڑوں دردناک آہیں اور کراہیں برسیں اور ہزاروں ارادے قبضۂ قدرت میں آجائیں یہ سب اس کے آدھے شعر کا ظہور ہے۔ اس کے کلام کی مٹھاس اس کے مشتاقوں کے کام و دہن کو شکر کی بارش کرنے والے لبوں کے شہد سے بھی بڑھ کر عزیز ہے لیکن اس کی گفتگو (شاعری) کی نمکینی، عاشقانہ مزاج رکھنے والوں کو معشوق کے تبسم کے نمکین پسینے سے بھی کہیں زیادہ لطف دیتی ہے۔ اس کی نظم اگر جادو ہے تو وہ جادو مباح ہے۔ اس کی فکر کا منبع اگر اکتساب ہے تو بھی اس کی صورت کرشمہ اور معجزے کی ہے۔ نظم و شعر کے جملہ اصناف میں مہارت تامہ ہے لیکن غزل سرائی اور مثنوی گوئی نسبتاً دیگر اصناف سے بڑھ کر ہیں اس کے کلام میں بلندی اور پستی دونوں نظر آتی ہیں لیکن اس کے اشعار میں رطب و یابس کبھی نظر سے نہیں گذرے۔

کسی نے خوب کہا ہے ؎

اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

یعنی شاعری اگر معجزہ بھی ہو تو بھی اعلیٰ و ادنیٰ سے مبرا نہیں ہو سکتی ید بیضا حضرت موسیٰ کا معجزہ ہی تھا کہ حکم الٰہی سے روشن ہوتا تھا مگر پھر بھی چھوٹی بڑی انگلیوں کا مجموعہ تھا۔

اور اس سلسلے میں مرزا رفیع سودا کا بھی احوال بیان کیا جا چکا ہے مرزا سودا بے حد منتخب اور بھرا پورا ہے۔ یہی ذکر کیا جاتا ہے کہ ریختہ کے چھ دیوان ہیں جن میں شاعری کے تمام اصناف کو نظم کیا گیا ہے ان میں ایک مسدس بھی ہے کہ جس میں واسوخت کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ اس مسدس کی شہرت بطور غازہ اس کی شاعری کے چہرے پر ہے۔ اصناف سخن میں اس کے قصیدہ میں عمدہ فکر نہیں ملتی حالانکہ اس کی غزل کہیں زیادہ

بلند مرتبہ کی ہے۔ اسی طرح اس کا قصیدہ پست مرتبہ کا ہے۔ ابتدا میں وہ شاہ جہاں آباد (دہلی) آیا تھا۔

اور یہاں اس کا تعلق (رؤسا کے ساتھ) ٹھیک سے بن نہیں پایا۔ ناکامی سے برگشتہ خاطر ہو کر وہ لکھنؤ چلا گیا اور وہاں نواب وزیر الممالک بہادر کی سرکار سے متعلق ہو گیا۔ اس کا دیوان دیکھا ہے اور اس سے اشعار انتخاب کر کے اس جگہ لکھ دیئے ہیں۔ یہ اشعار اس کے ہیں:۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا اس کا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

اتنی گزری جو ترے ہجر میں اسکے سبب
صبر مرحوم عجب مونس تنہائی تھا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں تھا

مسجد میں امام آ کے ہوا آج وہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں
دل سا عزیز جاں کا جنجال ہو گیا

تو وہ متاع ہے کہ پڑے جس کی تجھ پر آنکھ
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

فلک کا منہ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا
ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یہاں پہلے درد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

قاصد جو وہاں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا

کسی عاشق کے ترے جبہ سے ناخن کا خراش
خطِ تقدیر کے مانند مٹایا نہ گیا

کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں
داغ دل دیکھے بس چمن دیکھا

دل دینے کی ایسی حرکت اس نے نہیں کی
جب تک جیئے گا میر پشیمان رہے گا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے تو یہاں جی نکل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے
خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

آنکھیں چرائیو نہ ٹک ابر بہار سے
میری طرف بھی دیدۂ خوں بار دیکھنا

کفِ جاناں سے ممکن ہے رہائی میر کوئی ہو
اچنبھا ہے جو اس کے ہاتھ سے رنگ چھوٹا

ترے کوچے کے رہنے والوں نے
یہیں سے کعبہ کو سلام کیا

حالِ بد میں مرے ذرا آ کر
آپ کو سب میں نیک نام کیا

شہرۂ عالم اسے یمنِ محبت نے کیا
ورنہ مجنوں ایک خاک افتادہ ویرانہ تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے فلک
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

داغ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق
میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامے لے گیا

جواب نامہ سیاہی کا اپنے ہے وہ زلف
کسی نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتہ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی ہدایت ہی میر پر
کیا جانئے کہ حالِ نہایت کو کیا ہوا

نہ خون ہو آنکھوں سے بہا اور نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میر کسی کام نہ آیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

جہاں سے فتنے کو خالی کبھی نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

سب گئے ہوش و صبر تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسوسے تھے دبے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی تمیر ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے ترا نام وہ بیتاب سا ہوا

پھر آج میر مسجد جامع کے تھے امام
داغ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

کاہے کو میں نے میر کو چھیڑا کہ اس نے آج
یہ درد دل کہا کہ مجھے درد سر رہا

شب میکدے سے وارد مسجد ہوا تھا میں
پر شکر ہے کہ صبح تلک بے خبر رہا

اپنا بھی قصد تھا سر دیوار باغ کا
توڑا ہی تھا قفس کو پہ صیاد آگیا

مستی میں لغزش ہوگئی معذور رکھا چاہیے
اے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا

خانہ خراب میر بھی کتنا غیور تھا
مرتے موا پر اس کے کبھی گھر نہ جا پھرا

کم کم اٹھتا وہ نقاب آہ کہ طاقت رہتی
کاش یکبار ہمیں منہ نہ دکھایا ہوتا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

آزار دل نہیں ہے کسی دین میں درست
کیا جانے ان بتوں نے ستم کیوں روا رکھا

اس سری دل کی خرابی ہوئی اے عشق دریغ
تو نے کس خانہ مطبوع کو ویران کیا

میرا ہی مقلد عمل تھا
مجنوں کے دماغ میں خلل تھا

پشیماں ہوا دوستی کر کے میں
بہت مجھ کو ارمان تھا چاہ کا

اعجاز منہ کے ہے ترے لب کے کام کا
کیا ذکر یہاں مسیح علیہ السلام کا

رقعہ ہمیں جو آئے ہے سو تیر میں بندھا
کیا دیجئے جواب اجل کے پیام کا

کیونکر کل سے اس کی میں اٹھ کے چلا جاتا
یہاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ
کل تمیر کھڑا تھا یہاں سچ ہے کہ دوانا تھا

ہم کوئے مغاں میں تھے ماہ رمضاں آیا
صد شکر کہ مستی میں جاتا نہ کہاں آیا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی تمیر
سمند ناز پر اک اور تازیانہ ہوا

ڈرتا ہی میں رہا کہ پلک کوئی گر نہ جائے
آنکھوں سے رات اس کی جو تلوے ملا کیا

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھیر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

ماہ اس کو کہہ کے سارے شہر میں
مجھ کو مشکل منہ دکھانا ہوگیا

نہ گیا اس طرف کا خط لکھنا
ہاتھ جب تک مرا قلم نہ ہوا

دروازے پہ کھڑا ہوں کئی دن سے یار کے
حیرت نے حسن کے مجھے دیوار کر دیا

کاش اس کے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیر زمیں تمیر ہے آرام بہت

ہم تو آگے ہی مر رہے ہیں تمیر
تیغ کھینچے پھرے ہے یار عبث

خوگر ہوئے ہیں عشق کی گرمی سے خار و خس
بجلی پڑی رہی ہے مرے آشیاں کے بیچ

میرے سنگ مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

دو قدم ساتھ جنازے کے نہ آیا وہ تمیر
جانتا تھا کہ اسے ہے مری رفتار پسند

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے تمیر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

مرتا ہوں میں تو آدم خاکی کی شان پر
اللہ رے دماغ کہ ہے آسماں پر

قیامت تھا سماں اس خشمگیں پر
کہ تلواریں چلیں ابرو کی چیں پر

ہر گام سد رہ تھی بت خانہ کی محبت
کعبے تلک تو پہنچی لیکن خدا خدا کر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ضعف یہاں تک کھنچا کہ صورت گر
رہ گئے ہاتھ میں قلم لے کر

تمیر صاحب ہے چوکے اے بدعہد
ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر

تناسب پر اعضا کے اتنا بہ خیر
بگاڑا تجھے خوب صورت بنا کر

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

آتا ہے ابر قبلہ چلا خانقاہ پر — صوفی ہوا کو دیکھ کے کاش آئے راہ پر
منتظر قتل کے وعدے کا ہوں اپنے یعنی — جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہ گار ہنوز
حالانکہ عمر ساری مایوس گزری تس پر — کیا کیا رکھیں ہیں اس کے امیدوار خواہش
اب اس کے غم سے جو کوئی چاہے سو کھائے داغ
باقی نہیں ہے چھاتی میں اپنی تو جائے داغ

دل لگا ہو تو جی جہاں سے اٹھا — موت کا نام پیار کا ہے عشق
شاید کہ دیوے رخصت گلشن ہوں بیقرار — میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک
ہم گرے اس کے در ہی پر مر کر — اور کوئی وفا کرے کیا خاک
سب موئے ابتدائے عشق ہی میں — ہووئے معلوم انتہا کیا خاک
موجی سے عندلیب خریدار اس کی ہے — اے گل فروش کیجو سمجھ کر بہائے گل
اگر راہ میں اس کے رکھا ہے گام — گئے گزرے خضر علیہ السلام
ہوتا نہ دل کا یہ سرانجام عشق میں — لگتے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم
جی جائے کسی کا کہ رہے تم کو قسم ہے — مقدور تلک درپے آزار رہو تم
اس کے کوچے کی خاک لائیں گے ہم — اپنا کعبہ جدا بنائیں گے ہم
اے بتو اس قدر جفا ہم پر — عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا دکم — شیخ یہاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
نہ تنگ کر اسے اے فکر روزگار کہ میں — دل اس سے دم کے لیے مستعار لایا ہوں
چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر — ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں
اس کے نزدیک کچھ نہیں عزت — میر جی یونہی خوار ہوتے ہیں
شیخ عزلت تو تہہ خاک بھی پہنچے گی بہم — مفت ہے سیر کہ پھر عالم ایجاد نہیں
ہمیں تو نزع میں شرمندہ آکے اس نے کیا — رہا ہے ایک رمق جی تو کیا نثار کریں
نہ نگہ نہ پیام نہ وعدہ — نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں
ایک بیمار جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر — پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں
کہوں کب تک دم آنکھوں میں ہے میرا — نظر آئے ہے گا اب کوئی دم میرا

کیا تیر ستم اس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے — جس زخم کو چھیڑوں ہوں پیکاں نکلتے ہیں
مانند شمع ہم نے حضور اپنے یار کے — کار وفا تمام کیا ایک آہ میں
جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد — ہمیں آکے اس کے قدم دیکھتے ہیں
خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں — یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں — وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم — اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں
جفائیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں — بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
ایک سب آگ ایک سب پانی — دیدۂ دل عذاب ہیں دونوں
مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں — چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
اب کے ہمت صرف کر جو اس سے جی اچٹے میرا — پھر دعا اے میر مت کیجو اگر ایسا کروں
عشق کا گھر ہے میر سے آباد — ایسے پھر خانماں خراب کہاں
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی — جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں
کاش کہ دل دو تو ہوتے عشق میں — ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں
سب گئے دل دماغ و تاب و تواں — میں رہا ہوں تو کیا رہا ہوں میں
جائے ہے جی نجات کے غم میں — ایسی جنت گئی جہنم میں
کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں — یارب یہ آسمان بھی مل جائے خاک میں
شیوہ اپنا بے پروائی نومیدی سے ٹھہرا ہے — کچھ بھی وہ مغرور دے تو منت ہم سو بار کریں
قتل کیے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو
جان سے بھی ہم جاتے رہے ہیں آؤ تم بھی جانے دو

سرکاٹ کے ڈنوا دیئے انداز تو دیکھو — پامال ہے سب خلق جہاں ناز تو دیکھو
کب میسر اس کے منہ کا دیکھنا آتا ہے میر — پھول گل سے اپنے دل کو تم بھی بہلایا کرو
اس تیغ زن سے قاصد کہیو مری طرف سے — اب تک بھی نیم جاں ہے گر قصد امتحاں ہو
اٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغان شب — اس تیرہ روزگار میں تو میر اگر نہ ہو

اجرت میں نامہ بر کی دیتے ہیں جاں تلک تو
اب کارِ شوق اپنا پہنچا یہاں تلک تو

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے   آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو
خط لکھ کے کوئی سادہ نہ اس کو ملول ہو   ہم تو ہوں بدگمان جو قاصد رسول ہو
کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو   ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
دوستی ایک سے بھی تجھ کو نہیں   اور سب سے عناد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا   میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو
رات ساری تو گئی سنتے پریشاں گوئی   میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو
نزدیک اپنے ہم نے تو سب کر رکھا ہے سہل   پر میرؔ اس میں مردنِ دشوار کیوں نہ ہو
تلوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری اُدھر   تو اس ستم کا میرؔ سزاوار کیوں نہ ہو
خط آگیا پر اس کا تغافل نہ کم ہوا   قاصد مرا خراب پھرے ہے جواب کو
کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب   سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو
ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میرؔ   کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
ہوتے ہو بے دماغ تو دیکھو ہو ٹک اُدھر   غصہ ہی ہم پہ کاش کہ اکثر رہا کرو
یہ اضطرار دیکھ کہ اب دشمنوں سے بھی   کہتا ہوں اس کے ملنے کی کچھ تم دعا کرو
قبلہ و کعبہ خداوند و ملاذ و مشفق   مضطرب ہو کے اسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ
پر کہوں کیا رقم شوق کی اپنے تاثیر   ہر سرِ حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم   اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ
وصل اس کا خدا نصیب کرے   میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ
اس کے ایفائے وعدہ تک نہ جیئے   عمر نے ہم سے بے وفائی کی
زور و زر کچھ نہ تھا تو باری میرؔ   کس بھروسے پر آشنائی کی
وا اس سے سرِ حرف تو ہوگا کہ یہ سر جائے   ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے
تجھ کو مسجد ہے مجھ کو مے خانہ   واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

کہیں جو کچھ ملامت گر بجا ہے میرؔ کیا جانیں   انھیں معلوم تب ہوتا کہ ویسے جدا ہوتے
دل کو تسکین نہیں اشک دمادم سے بھی   اس زمانے میں گئی ہے برکت غم سے بھی
آج پھر تھا بے حمیت میرؔ وہاں   کل لڑائی سے لڑائی ہو چکی
بین جو بولا کہا کہ یہ آواز   اسی خانہ خراب کی سی ہے
آہ میری زبان پر آئے   پھر بلا آسمان پر آئے
جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے   اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے
اس ستم گار کے کوچے کے ہواداروں میں   نام فردوس کا ہم لے کے گنہگار ہوئے
باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم   کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئے
آلودہ اس گلی کی جو ہوں خاک سے تو میرؔ   آبِ حیات سے بھی نہ وہ پاؤں دھوئے
میکدے سے نوا بھی آیا ہے مسجد میں میرؔ   ہو نہ لغزش کہیں صحبت ہے یہ بیگانوں کی
جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے   کتنے ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
گھبرا نہ میرؔ عشق میں اس سہل زیست پر   جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے
دو حرف اس کے منہ کے تو لکھ بھیجیو شتاب   قاصد چلا ہے چھوڑ کے تو جاں بلب مجھے
اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے روبرو   رنجش کی وجہ میرؔ یہ کیا بات ہو گئی
اب رحم پر اسی کے موقوف ہے کہ یہاں تو   نے اشک میں سرایت نہ آہ میں اثر ہے
گھر دودِ جگر سے بھر گیا آہ   کب تک مری چشم تر نہ ہووے
سرگذشتیں نہ مری سن کہ اچٹتی ہے نیند   خاصیت یہ ہے مری جان ان افسانوں کی
پہنچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حال میرؔ   اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے
کیا کروں شرحِ خستہ جانی کی   میں نے مر مر کے زندگانی کی
میرے تغیرِ حال پر مت جا   انقلابات ہیں زمانے کے
دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا   اور بھی وقت تھے بہانے کے
اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں   ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے
دل و دین ہوش و صبر سب ہی گئے   آگے آگے تمہارے آنے کے

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق　　　وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میرؔ　　　سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ　　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے　　　اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے

سرہانے میرؔ کے کوئی نہ بولو　　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

بہت سعی کیجئے تو مر رہیئے میرؔ　　　بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہے تو کہیں　　　القصہ خوش گزرتی ہے اس بدگمان سے

جس جگہ دورِ جام ہوتا ہے　　　وہاں یہ عاجز مدام ہوتا ہے
میر صاحب بھی اس کے ہاں تھے پر　　　جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

کبھو وادیٔ عشق دکھلایئے　　　بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے

آتے کبھی جو وہاں سے تو یہاں رہتے تھے اداس
آخر کو میرؔ اس کی گلی ہی میں جا رہے

کھل گئی بات تھی سو ہر اک پر　　　تو وہی منہ چھپائے جاتا ہے
وہ تو بگڑے ہے میرؔ سے ہر دم　　　اپنے سے یہ نبھائے جاتا ہے

کعبہ میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے　　　آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے

نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا　　　پر ہمارا نہ مدعا سمجھے

آسماں شاید ورے کچھ آ گیا　　　رات سے کیا کیا رکا جاتا ہے جی

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی　　　اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

تیز یوں ہی نہ تھی شبِ آتشِ شوق　　　تھی خبر گرم اس کے آنے کی

رحم بھی دینا تھا تھوڑا ہائے اس خوبی کے ساتھ　　　تجھ سے کیا کل گفتگو یہ داورِ محشر سے ہے

وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشمِ تر سے　　　ابر کیا کیا اٹھے ہنگامے سے کیا کیا برسے

یہ رات، ہجر کی یہاں تک تو دکھ دکھاتی ہے
کہ شکل صبح مری سب کو بھول جاتی ہے

ڈر کیوں نہ محلے میں رہے رونے سے میرے　　　سیلاب نے اس کوچے میں گھر مول لیا ہے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　　افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں　　　منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

قاصد کے تصنع نے کیا دل کے تئیں داغ　　　بے تاب مجھے دیکھ کے کچھ بات بنائی

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ　　　آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

حسرت سے دیکھ رہیو لے نامہ بر منہ اُس کا　　　بس اور کچھ نہ کہیو ہرگز مری زبانی

حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں　　　مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے

پتھر کی چھاتی چاہیئے ہے میرؔ عشق میں　　　جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

فریادِ شب کی سن کے کہا بے دماغ ہو　　　دیکھو تو اس بلا کو یہ شاید کہ میرؔ ہے

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے　　　خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں　　　اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط　　　اس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے

اس کا غضب ہے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے　　　لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

خدا کرے مرے دل کو ٹک اک قرار آئے　　　کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آئے
نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میرؔ
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آئے

حرف النّون

ناجیؔ

ناجیؔ تخلص اور نام محمد شاکر ہے۔ اسی شہر کے شعرا میں سے ہے۔ محمد شاہ کا ہم عصر ہے۔ اس کی طبیعت ایہام کی طرف مائل تھی۔ یہ اشعار اس کے ہیں:۔